بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ

از شیخ الحدیث حضرت مولانا انظر شاہ مسعودی صاحب مدظلہٗ

محمد حسین آزاد نے ''آبِ حیات'' میں مرزا مظہر جانِ جاناںؒ کی نزاکتِ طبع اور لطافتِ مزاج کے بہت سے واقعات سنائے ہیں، ''ارواحِ ثلاثہ'' میں بھی مرزا کے متعلق کچھ اس طرح کے واقعات و حکایات موجود ہیں جنھیں دیکھ کر بے تکلف کہا جا سکتا ہے کہ ؎

نزاکت اس گلِ رعنا کی دیکھیو انشاء
نسیم صبح جو چھو جائے ہو رنگ میلا

ان حکایات و واقعات کی تاریخی حیثیت کچھ بھی ہو، لیکن مرزا شہیدؒ کی لطافتِ طبع متعلقہ بیانات کی قدرِ مشترک ہے۔ لطافت و کثافت کا بھی عجیب معاملہ ہے، یہ بود و باش میں بھی نمایاں اور لباس و پوشاک میں بھی، میل ملاپ میں بھی عیاں اور تحریر و تقریر میں بھی۔ شہید مرزاؒ نے اپنے ایک دوست کی وفات پر تعزیتی خط لکھا ہے جو آج بھی مرزاؒ کی نگارشات میں موجود ہے، تعزیتی الفاظ یہ ہیں: ''مرنے والے نسخۂ انسانیت تھے، ان کی وفات کا زخم قیامت تک مندمل نہ ہوگا۔'' خدا جانے جن مرحوم کے لئے تعزیت میں یہ الفاظ مرزاؒ کے قلم سے ٹپکے، وہ کیا کچھ تھے، لیکن حقیقۃً یہ

الفاظ اپنے حدودِ اَربعہ کے اعتبار سے بروز اتوار ۱۷؍جولائی ۱۹۸۳ء دن کے سوا گیارہ بجے ایک ناتواں بلکہ ناتوانیوں کا ڈھیر، ضعیف، بیماریوں کے مسلسل حملوں سے ناچار، رنج وغم کا پیکر، اَلم و اَسف کا مجسمہ، شرافت کا قطب مینار، انسانیت کا مجموعہ، فضائل و شمائل کا ہمالہ، علم و وقار کا کوہِ شوالک، نیکیوں کا بیت المقدس، صلاح وتقویٰ کا کعبہ، مسترشدین کا قبلہ، معتقدین کا محبوب، مخالفین کا ہدف، حریفوں کی تیروں کی آماج گاہ، یعنی حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب حظیرۃ القدس پر ہر طرح صادق ہیں۔ آج سے ۹۴ سال قبل مرحوم نے اس عالم رستاخیز میں قدم رکھا اور قدم بھی ایک حظیرۃ القدس میں یعنی حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم کے صاحب زادہ مولانا حافظ احمد صاحب کی آغوشِ شفقت میں، حافظ مرحوم کی شادی پر کافی عرصہ گزر گیا تھا لیکن کوئی بچہ پیدا نہ ہوا، گھر میں بے چینی تھی، متعلقین تڑپتے، اقرباء صورتِ حال پر بلبلا رہے تھے، حضرت نانوتویؒ کے تلامذہ جو آسمانِ علم کے آفتاب، ربانیت اور خداپرستی کے ماہتاب تھے، مضطر باز دست بدعا ہوگئے تا آنکہ دیوبند اور اس کے قرب و جوار بلکہ دُور دراز علاقوں میں اگر کسی مستجاب الدعوات کا علم ہوتا اس سے بھی دُعا کی درخواست کی جاتی۔ خدا پرستوں کی یہ دُعائیں کب خالی جاتیں، دیر آید دُرست آید کے مطابق مجیب الدعوات نے خانوادۂ قاسمی کو بچہ ہی عنایت نہ کیا بلکہ مجموعہ انسانیت عطا کیا، حضرت نانوتویؒ تو آنکھ بند کرچکے تھے، لیکن دادی نے بلائیں لیں، تلامذہ قربان ہوئے، گھر میں شادیانے خوشی کے بجے اور مسرتوں کو طشتوں میں رکھ کر لٹایا گیا، اس ناز کے ساتھ حضرت کی پرورِش ہوئی کہ جب گڈلیوں چلنے لگے تو اصلی گھی کا بھرپور ایک پیپا حضرت مرحوم نے توشہ خانے میں گھس کر گرادیا، کیسا ڈانٹنا، کیسا ڈپٹنا، کہاں کی دھمکی، کہاں کی جھڑکی، دادی نے پوتے کی اس شوخی پر دیوبند کے گھروں میں اس عنوان کے ساتھ مٹھائی تقسیم کی کہ آج میرے پوتے نے ایک شرارت کی ہے۔ شعور نے آنکھیں کھولیں تو اس نومولود کو امامِ ربانی قطبِ عالم مولانا رشید احمد گنگوہیؒ

کی پُرنور گود میں ڈالا گیا، حضرتؒ نے آنکھوں سے لگایا، سینۂ معرفت سے چمٹایا، لبِ مبارک سے بوسہ دیا۔ بڑھتے بڑھتے کچھ بڑے ہوئے تو ایک روز خانقاہِ گنگوہ میں اِمامِ ربانی کے پاؤں دابنے کی سعادت کے شوق میں دُوسرے خدمت گاروں کے ساتھ شریک ہوگئے، اِمامِ ربانی بہت حساس و نازک مزاج تھے، لطافت زَدہ مستزاد بھاری بھرکم ہاتھوں کے ساتھ معصوم ہتھیلیوں کا فوراً ادراک فرمایا، مڑکر دیکھا تو مولانا قاری محمد طیب صاحب اپنی نازک ہتھیلیوں سے سعادت سمیٹ رہے تھے، اِمامِ ربانی معاً اُٹھ کر بیٹھ گئے، سینے سے لگایا، فرمایا: تم جس خاندان کے چشم و چراغ ہو اس سے اس طرح کی خدمت لینا، میری شقاوت ہوگی۔ کچھ بڑے ہوئے تو شیخ الہند محمود الحسنؒ سے بسم اللہ کرائی گئی، اس مبارک کی ابتدا میں سپہرِ علم کے درخشاں ستارے بھی تھے اور چرخِ معرفت کے مقدس سیارے بھی۔ زندگی نے آگے قدم بڑھایا تو مولانا محمد انور شاہ الکشمیریؒ کی درس گاہ میں زانوئے تلمذ طے کیا اور وہیں سے سندِ فراغت لی۔ اندرونِ خانہ بڑوں میں شادی کی گفتگو چلی تو دیوبند کے قریب ہی رامپور پنہاراں میں مولانا محمود احمد صاحب رامپوری وزیرِ مال ریاست اندرگڑھ، رکنِ شوریٰ دارالعلوم و رئیس رامپور کے یہاں منگنی کی تجویز کی گئی، شیخ الہندؒ نے فرمایا کہ: ''پیغام میں لے کر جاؤں گا۔'' یہ رامپوری رئیس دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور شیخ الہندؒ کے ارشد تلامذہ میں بھی تھے، شیخ الہندؒ رامپور پہنچے تو مولانا کے گھرانے میں خوشی کی لہر دوڑ گئی کہ اُستاذ آئے ہیں اور اُستاذ بھی عظیم المرتبت، شیخ الہندؒ نے بیٹھتے ہی فرمایا کہ: ''بھائی میں اُستاذ کی حیثیت سے نہیں آیا، بلکہ نائی کا کام انجام دینے آیا ہوں۔'' پیغام دیا، مجالِ انکار کس کو تھی، تقریبِ شادی کے موقع پر مولانا خلیل احمد صاحبؒ مہاجرِ مدنی نے تمنا کی کہ خلعتِ عروسی طیب کے میں زیبِ بدن کروں گا، چنانچہ حکیم الاُمت مولانا تھانوی قدس سرہٗ نے عرض کیا کہ نکاح میں پڑھاؤں گا۔ یہ تھا مولانا قاری محمد طیب کا نشو ونما اور اُٹھان کہ بزرگ بلائیں لیتے تھے، اہلِ علم قربان ہوتے، اَربابِ فضل نثار ہوتے۔ دُلہن

رُخصت ہوکر رامپور سے چلیں تو دیوبند سے کئی میل آگے نکل کر دارالعلوم کے طلباء نے ڈولے کو اپنے کاندھوں پر اُٹھایا اور اسی شان سے لے درِ دولت تک پہنچے۔ دارالعلوم سے فراغت کے ساتھ ہی شیخ الہندؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت کی، خواجہ تاش مولانا مفتی محمد شفیع مفتیٔ اعظم پاکستان تھے، شیخ الہندؒ مستعد برائے ہجرت ہوئے تو دونوں کی اس درخواست پر کہ حضرت اب ہم کس کی طرف رُجوع کریں؟ جواب باصواب تھا کہ مولانا محمد انور شاہؒ سے اصلاحی تعلق قائم کرلیا جائے، ان کی وفات کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نائب مہتمم دارالعلوم سے استدعا کی اب ہمارا تعلق مولانا تھانوی سے کرادیا جائے، مولانا حبیب الرحمٰن نے سفارشی خط لکھا، مرشد تھانویؒ اس خانوادہ سے معتقدانہ تعلق کے باوجود بڑے ضابطے کے انسان تھے، جواب میں تحریر فرمایا کہ:

> مولوی محمد طیب کی خدمتِ اصلاح میری سعادتِ دِین و دُنیا ہے، لیکن مسترشدانہ خط، سفارش کی صورت میں نہیں بلکہ خود مسترشد کا آنا چاہئے۔

چنانچہ عریضہ روانہ خدمت کیا گیا، رمضان المبارک کے مہینے میں مہتمم صاحب نے حاضری کی اجازت چاہی، اجازت مل گئی، مفتی محمد شفیعؒ کی معیت میں تھانہ بھون کا پہلا سفر ہوا، قاری صاحبؒ اپنی خوش الحانی میں شہرہ آفاق ہوچکے تھے، جب تھانہ بھون پہنچے، موجود ذاکرین و شاغلین نے حضرت تھانویؒ سے عرض کیا کہ قاری صاحب سے تراویح میں قرآن پڑھنے کے لئے کہا جائے، ضابطے کا جواب یہ تھا کہ دِل میرا بھی چاہتا ہے لیکن استدعا سے گریز ہے چونکہ جبر کا اِمکان ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ مولوی طیب صاحب میرے کہنے پر بادِلِ نخواستہ اس صورت کو قبول کریں، بہتر یہ ہے کہ قاری صاحب سے بے تکلف دریافت کی جائے کہ تراویح کا معمول کیا رہے گا، قاری صاحبؒ کی طرف رُجوع کیا گیا تو فرمایا: کمرے میں نوافل میں قرآن شریف پڑھوں گا، اس پر حضرت تھانویؒ نے درخواست گزاروں سے فرمایا کہ اب جاکر پوچھا

جائے کہ بجائے نوافل کے اگر تراویح میں اور خانقاہ کی مسجد میں آپ قرآن شریف پڑھیں تو کیا مضائقہ ہے، قاری صاحبؒ نے اس صورت کو سعادت قرار دیا۔

مسندِ خلافت و اہتمام

حکیم الاسلامؒ اِمام تھے اور حکیم الاُمتؒ مقتدی۔ پہلی ہی تراویح سن کر حضرت حکیم الاُمتؒ باغ و بہار ہوگئے۔ مجالس میں بار بار تعریف کی، خوش الحانی کا دِلدادہ اپنے آپ کو بتایا، قاری صاحب مرحوم کی سعادت مندانہ افتادطبع کی مداحی کی اور قلیل مدّت میں اس اِمامِ رُشد و ہدایت نے مسندِ خلافت عطا فرمائی۔ اصلاحِ باطن کی اس تعمیر کے ساتھ دارالعلوم میں معین المدرسی کے عہدے پر تدریس کا کام شروع کیا، گنے چنے تلامذہ اب بھی موجود ہیں، جن کا متفقہ بیان ہے کہ قاری صاحبؒ زمانۂ طالب علمی، عہدِ شباب ہی میں عبادت کا ذوق، بندگی کا شوق، فرشتوں کی سی معصومیت اور عارفین کی معرفت کا منظر پیش کرتے، اسی زمانے سے تہجد و اَوّابین کا غیر منقطع سلسلہ جاری ہوا، جو صبحِ موت تک چلتا رہا۔ معین المدرسی سے نیابتِ اہتمام کی جانب قدم بڑھایا اور والد مرحوم کی وفات کے بعد حضرت تھانویؒ کی تجویز اور دارالعلوم دیوبند کے اربابِ مشورہ کی تائید سے مہتمم منتخب ہوئے۔ ساٹھ سال اس عہدے پر اس شان سے گزرے کہ تاریخ حیرت زدہ ہے، زمانہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہے، چشمِ فلک نے ٹکٹکی لگا رکھی ہے اور ایک عالم غرقِ حیرت ہے، اس طویل عرصے میں نہ جانے کتنے نشیب و فراز آئے، کتنے سنگلاخ آئے، کتنے ہفت خواں آئے، پہاڑوں کی سی رُکاوٹیں کھڑی ہوئیں، طوفانوں نے قدم روکنا چاہا، فتنوں کے سیلاب اُمنڈے، مخالفتوں کا طوفان اُبلا، عداوتوں کی آندھیاں چلیں، مخاصمتوں کے بگولے اُڑے، اور ایک وقت تو وہ آیا کہ اَز مبتدا تا خبر، اَز اَوّل تا آخر، سوائے عداوت اور مخالفت کے اور کچھ نہ رہا، لیکن یہ حلم کا پہاڑ، وقار کا بادشاہ، مکارمِ اخلاق کا خسرو، شرافت و انسانیت کا شہنشاہ،

مروّتِ وفا کا تاج دار، اپنی جگہ سے قطعاً نہیں ہلا، اِستقامت میں فرق نہیں آیا، طمانیت نے لڑکھڑانا نہ جانا، سب نے سنا، سب نے کہا، حریف دست وگریباں ہوئے، چھوٹوں نے ان کی دستارِ فضیلت سے کھلواڑ کیا، مگر مرحوم نے کسی کو نہ جواب دیا، نہ کوئی انتقامی کاروائی کی، نہ غیظ وغضب کا مظاہرہ کیا، بلکہ غم کا ہمالہ اپنے دِل پر لے کر اس دُنیائے دُوں سے رُخ موڑ لیا۔ مہتمم صاحب مرحوم کے اوصافِ خصوصی میں حلم تھا، جس کی نظیر ومثال صدیوں کے اَربابِ انتظام میں نہیں ملتی۔ تصوّر کیجئے کہ تین سو کا عملہ ان کے ساتھ تھا، جس میں اچھے بھی تھے اور بُرے بھی، فرض شناس بھی تھے اور لااُبالی بھی، خیر بھی وجود میں آتا اور شر بھی، مگر کیا مجال کہ حضرت مہتمم صاحبؒ کے حلم میں کوئی فرق پیدا ہو۔ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ مخالفتوں کا طوفان ہزاروں میل کی رفتار سے اُٹھا اور ان سے مسلسل ٹکراتا رہا، مگر ان کے حلم میں ذرّہ برابر کمی نہیں آئی، ایک شقی القلب نے جبکہ یہ پچاسی سالہ عمر سے گزر رہے تھے اور زکریا (علیہ السلام) کے لہجے میں: ''قَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا'' یعنی بڑھاپے کی وجہ سے ہڈیوں میں بھی گودا نہ رہا، کا پیکر بنے ہوئے تھے۔ ایک بے سروپا نہیں بلکہ فحش داستان نہایت متعفن لب ولہجے میں بعنوان ''امریکہ میں مولانا قاری محمد طیب کی عشق بازیاں'' اپنے اخبار میں لکھ کر شقاوتِ اَزلی کا مظاہرہ کیا تو دیوبند کے دو نامور صحافی حضرتؒ کے حلم کا امتحان لینے کے لئے یہ اخبار لے کر ان کی خدمت میں جا پہنچے، اخبار ان کے ہاتھوں میں تھا، عادت یہ تھی کہ جو چیز پڑھنے کی ملتی اُسے پورا پڑھ لیتے، مصروفِ مطالعہ ہوگئے، پورا مضمون پڑھ ڈالا، صحافی ان کے چہرہ وبشرہ کا جائزہ لیتے رہے مگر کیا مجال کہ چہرے پر آثارِ غضب نمایاں ہوں یا پیشانی پر تلخ احساسات کی کوئی لکیر پڑی ہو، مطالعے سے فراغت پر گردن اُٹھی اور لب ہائے نازک پر وہی دِلنواز مسکراہٹ کھیل گئی، دریافت فرمایا کہ یہ اخبار کچھ بِک بھی جاتا ہے؟ تو انہوں نے عرض کیا کہ بِکتا ہے اور پڑھا جاتا ہے، اسی وجہ سے تشویش ہوئی اور آپ کی خدمت میں تردید کے لئے

حاضر ہوئے، مگر دونوں کی توقعات پر آنے والا جملہ ارشاد فرما کر برف کے تودے پہ تودے گرادیئے:

بھائی یہ میری کتنی بڑی سعادت ہے کہ لوگ مجھے گالیاں دے کر اپنا پیٹ پالتے ہیں اور مجھے مفت کا ثواب مل رہا ہے۔

بوڑھے کے اس حلیم جواب پر نوجوان صحافی غرقِ حیرت ہوگئے۔ فتنہ ہی کے دور میں انہیں خائن بھی کہا گیا اور غائن بھی، بددیانتی کا بھی الزام عائد ہوا، اور کذب بیانی کا بھی تا آنکہ ایک پوسٹر نکلا جس کا عنوان تھا:

"الملک الکذّاب المغضوب عند اللہ ورسولہ قاری محمد طیّب"

حالانکہ اس الملک الکذّاب کی صداقتِ لسانی کا یہ عالم تھا کہ ۲۱/اکتوبر ۱۹۸۱ء کو دارالعلوم کی مسجد میں خطاب کے دوران شور وغل ہوا اور زبردست دوتین دھماکے، ان کا گھیراؤ ہوا، بڑی مشکل سے ان کو اس گھیراؤ سے نکالا گیا۔

سنگ باری ہو رہی تھی، لاؤڈ اسپیکر پر قبضہ کرلیا گیا تھا، صبح کو دو مقامی وکیل رپورٹ قلم بند کر رہے تھے جس میں یہ بھی تھی کہ: ''مجھ پر قاتلانہ حملہ ہوا'' رپورٹ ترتیب دے کر مرحوم کو سنائی گئی، جب مذکورہ جملہ ان کے کانوں میں پڑا تو فرمایا کہ: ''میں اس کا مدعی نہیں ہوسکتا'' عرض کیا گیا کہ: کیا آپ نے دھماکے کی آواز نہیں سنی تھی؟ فرمایا کہ ''ضرور سنی تھی''، پھر یہی تو حملہ تھا، ارشاد ہوا کہ ''میں اس کے باوجود قاتلانہ حملے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔'' وکلاء نے کہا کہ اس کے بغیر مقدمے میں جان نہیں پڑے گی، تو جواباً یہ فرماتے ہوئے مجلس سے اُٹھ گئے کہ ''میں اسے نہیں جانتا کہ جان پڑے گی یا نہیں۔'' ان کے سب سے بڑے حریف نے ایک موقع پر تقریر کرتے ہوئے یہاں تک کہہ ڈالا کہ:

مجھے اندیشہ ہے کہ مہتمم صاحب کا خاتمہ ایمان پر نہ ہوگا۔

ناقل نے یہ جملہ بلاکم وکاست خود مرحوم کو سنادیا اور اس یقین کے ساتھ کہ کم از کم یہ

جملہ اس حلم کے پہاڑ کو آمادۂ لرزش کردے گا، مگر اسے بھی سن کر وہ تکیہ پر سر رکھتے ہوئے بولے کہ:

بھائی یہ خدا ہی جانتا ہے کہ کس کا خاتمہ ایمان پر ہوگا اور کس کا نہیں۔

اور استدلالاً یہ آیت پڑھی: ''وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَکْسِبُ غَدًا''۔ ان کی وفات کے بعد بنگلہ دیش کا چار رُکنی وفد برائے تعزیت دیوبند پہنچا تو ان سے معلوم ہوا کہ اسی حریف کو بنگلہ دیش میں عام و خاص نے گھیر کر پوچھا کہ:

مہتمم صاحب جیسے دیرینہ خادم کو دارالعلوم سے کیوں جدا کیا؟

تو ظالم کا جواب یہ تھا کہ:

مہتمم صاحب کو دارالعلوم سے نکالنا دینی فرض ہوگیا تھا چونکہ انہوں نے دعوئ نبوّت کیا تھا۔

مجھے یقین ہے کہ اگر وہ اپنی زندگی میں اس سب سے بڑے باطل اور بھونڈے الزام کو سنتے تو ان میں ذرا بھی اشتعال پیدا نہ ہوتا۔ از گجرات تا بمبئی ایک ذمہ دار نے یہ من گھڑت بھی پھیلائی کہ:

تیسرے سال دارالعلوم کے خزانے سے ایک لاکھ چھتیس ہزار روپے کی ہونے والی چوری کے مرتکب خود مہتمم صاحب تھے، وہ ٹھیٹھ ایک ڈاکو کی شکل میں منڈاسا بر سر، ڈھاٹا بر رُخسار وقتِ شب خزانے میں داخل ہوئے نوٹ دو تھیلوں میں بھر لئے اور سر پر موجود قزاقانہ پگڑی میں سونے کے پتر رکھ لئے، بوڑھا ڈاکو خزانے سے باہر اندھیرے میں چلا تو کچھ بوجھ، کچھ بڑھاپا، اندھیرا گھپ، زینے سے لڑکھڑا کر نیچے گرا تو چور چور کا شور ہوا، روشنی کی گئی، آدمی دوڑے تو خود مہتمم تھا۔

استغفر اللہ والعیاذ باللہ، یہ من گھڑت مرحوم کے کانوں میں پڑ گئی تھی، مگر

اس ظلم و عدوان کا بھی جواب ایک محبوبانہ وحکیمانہ مسکراہٹ کے سوا کچھ نہ تھا، ہوسکتا ہے کہ ان کے نادان مقتدین سے نادانیاں ہوئی ہوں لیکن وہ سب مرحوم کے کھاتے میں جمع کی جاتی رہیں، حریف حلقے میں کسی چھوٹے بڑے کو اس کی توفیق نہیں ہوئی کہ ان کی طرف براہِ راست رُجوع کرلے، اور ادھر مرحوم کا یہ عالم تھا کہ کھاتہ میں درآمد کی جانے والی ان خرافات پر بھی زبانِ حال سے یہ پڑھتے ہوئے ساکت وصامت رہے:

تا منفعل زرنجش بیجا نبینمیش — می آزم اعترافِ گناہ نکردہ را

آٹھ سال مکمل خاکسار کی ان کے ساتھ خلوَت و جلوَت میں شرکت رہی، خصوصاً یہ آخری تین سال فتنوں سے لبریز، تیروں کی بھرمار، الزامات کی بوچھاڑ، نکتہ چینیوں کے طوفان میں شب و روز کی یکجائی تھی، وہ اُٹھ گئے اور ایک دن اس خاک کو بھی ''كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ'' کا جام ہونٹوں سے لگانا ہے، مجھے ان کی قبر میں نہیں سونا اور نہ ان سے میرے حساب و کتاب کی پُرسش ہوگی، مگر میں پورے وثوق اور محاسبۂ آخرت کے یقین کے ساتھ شہادت دیتا ہوں کہ انہوں نے اپنے بڑے سے بڑے ستم گار، حریف اور پئے آزار، ناشائستہ و نابکار کے حق میں بھی زبان پوری قوّت سے بند رکھی، اس لب و لہجے میں جواب الجواب تو درکنار، مبنی برحقیقت، مہذّب تردید کے لئے بھی تیار نہیں ہوئے، غیبت کا ان کے یہاں دروازہ پوری قوّت سے بند تھا، بہت کچھ کسی کے حق میں فرماتے تو یہ: ''بھائی بڑا اچھا آدمی تھا، کاش کہ کسی مفید کام میں لگتا'' یا ''فلاں صاحب تو اپنے ہی ہیں، خدا جانے ان کو کیا ہوگیا'' حالانکہ کبھی کبھی ان کے متعلقین پر ان کا یہ انداز گراں گزرتا، وہ مصلحت اور ضرورت کا تقاضا سمجھتے کہ حضرت کچھ جواب دیں، مگر یہاں لاکھوں کروڑوں تیروں کا ایک جواب ''نشانہ بننا تھا، نہ کہ نشانہ لگانا'' صورتِ حال پر کبھی بہت ہی دِل آزار ہوئے تو فتنے کے طول وعرض کو واضح کرنے کے لئے فضا میں اپنی انگشتِ شہادت گھماتے ہوئے فرماتے کہ:

بھائی یہ ہر وقت کی ہو ہو ہمیں تو اچھی نہیں لگتی، ہمارا تو لکھنا پڑھنا

بھی ختم ہوگیا۔

وقار اس طرح کوٹ کوٹ کر ان کی فطرت میں بھرا گیا تھا کہ کبھی بے وقاری کا کوئی پَرتو ان کی زندگی وکردار میں نہ نظر آیا۔

جس شب میں دارالعلوم پر قبضہ کیا گیا، ایک شور تھا اور ایک غل، لاؤڈ اسپیکر سے برابر اعلان ہو رہا تھا کہ:

> قاری طیب کا جنازہ دارالعلوم سے نکال دیا گیا، اب وہ کبھی لوٹ کر نہ آئے گا۔ ہم سے جوٹکرائے گا پاش پاش ہوجائے گا۔

یہ مبارزانہ جملے مسلسل دارالعلوم کی مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے نشر ہو رہے تھے، وہ حسبِ معمول آخرِ شب میں تہجد کے لئے بیدار ہوئے، شور ان کے کانوں میں پڑا تو ایک بیٹے سے دریافت کیا کہ: ''یہ جلسہ اس وقت کہاں ہو رہا ہے؟''

بیٹے نے دفع الوقتی سے کام لیا، ذوق وشوق کے عالم میں تہجد سے فراغت ہوئی، مرحوم نے منہ میں پان دبایا پھر پوچھا کہ ''اب تک یہ جلسہ ختم نہیں ہوا، عجیب جلسہ ہے کہ ساری رات سے چل رہا ہے۔'' صبح ہوتے ہوتے دارالعلوم پر غاصبانہ قبضے کی دِلدوز خبر ان کے کانوں تک پہنچ گئی، مجھے تمام رات دارالعلوم کے جانے سے زیادہ یہ فکر رہا کہ کہیں یہ صدمۂ جانکاہ مرحوم کے لئے جان لیوا ثابت نہ ہو، صبح دَرِ دولت پر حاضری ہوئی تو وہ کوہِ وقار تعزیت کرنے والوں کی دھاڑیں سننے کے باوجود تسلی دیتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ:

> بھائی حکومتیں بدل جاتی ہیں، حاکم بدل جاتے ہیں، بادشاہتیں ختم ہوجاتی ہیں، بادشاہ بدل جاتے ہیں، دارالعلوم کا چلانا اور اس پر قبضہ ہوجانا بھی اسی طرح کا ایک واقعہ ہے۔
>
> اور اس کے بعد یہ فرماتے ہوئے کہ:
>
> میں نے اپنے لئے تین چیزیں منتخب کرلیں، سکوت، صبر، اِستغناء۔

ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئے۔ کانپور میں کچھ لوگوں نے ان کے آخری سفر میں انہیں کریدنا چاہا تو ذرا تلخی کے ساتھ فرمایا کہ:

میں اس غم کو کھرچ کھرچ کر اپنے دِل سے باہر نکالتا ہوں اور آپ مجھے اسی میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔

اس پر مجلس میں سناٹا ہوا اور سوال و جواب کا سلسلہ ہاتھوں سے نکل گیا۔

صبر و اِستغناء کا پیکر

ساٹھ سال انہوں نے دارالعلوم کا اہتمام کیا، دارالعلوم کی موجودہ تمام ترقیات ان کے میمون عہد کی یادگار ہیں۔ دارالعلوم ان کے جدِ اَمجد کا لگایا ہوا گلشن ہے، جس کے بلاشبہ مرحوم باغبان تھے، مگر دارالعلوم کے چلے جانے کے حادثے کے باوجود نہ وہ مضطرب ہوئے، نہ ان کے جامِ صبر وضبط میں کوئی چھلکا لگا، کوئی ان کی جگہ پر ہوتا تو تڑپ اُٹھتا اور اپنی تڑپ سے ایک عالم کو تڑپا دیتا۔ ان کے مرید بھی تھے اور معتقد بھی، ان کی تحریر جاندار تھی، خطابت کے وہ بادشاہ تھے، دُنیا انہیں جانتی تھی اور وہ عالم میں متعارف تھے، اگر جوابی اور منتقمانہ کاروائی پر اُتر آتے یا کم از کم اپنا کیس ہی واقعاتی شکل میں دُنیا کے سامنے رکھتے تو حریفوں کے لئے ایک مسئلہ بن جاتے، مگر وہ اپنی زندگی میں شہرِ خموشاں بنے رہے، حریف ان کے زندہ مزار پر فاتحہ تو کیا پڑھتے، اس زندہ درگور کے لاتیں لگاتے رہے، گھونسے چلاتے رہے، مکے دِکھاتے رہے، منہ چڑاتے رہے مگر اس عجیب وغریب انسان نے خاموشی کا کفن پاؤں کی اُنگلی سے تا سر، اس طرح پہنا تھا کہ زندہ لاش میں کوئی حرکت وتموّج مل ہی نہ سکے، اور اب تو صرف اتنا ہی ان کے حریفوں سے کہا جاسکتا ہے:

قد تقدم الخصم الی موقع الفصل   وأنت علی الأثر مستقدم فتعلم

مگر یقین رکھنا چاہئے کہ ان کی مظلومیت رنگ لائے گی، ان کا صبر ایک نیا

تماشا دِکھائے گا اور اس تماشے کا شکار ان کے بدترین حریف ہوں گے۔ حلم کے ساتھ خدا تعالیٰ نے ان کو منکسر المزاجی کی دولت عطا کی تھی، چھوٹوں سے بھی معاملہ اس طرح کا فرماتے گویا وہ ان کے بڑے ہیں، اگر کسی کی بات مدلل ہوتی، مقدمہ بھی صحیح اور دلائل بھی واقعاتی تو پھر بات کسی جانب سے آئے چھوٹا ہو یا بڑا، محکوم ہو یا حاکم، ملازم ہو یا آقا فوراً اسے قبول فرمالیتے، بڑے سے بڑے مجرم کے لئے تنبیہ و سرزنش کا ان کے یہاں جواز ہی نہ تھا۔ دارالعلوم کے ایک دفتر میں کچھ گڑبڑ ہوئی، سب نے ان سے عرض کیا کہ آپ سرزنش فرمائیں، ایک عرصہ تک اس تلخ فریضے سے کٹتے رہے، ایک دن بڑے اصرار پر تیار ہوئے، مجرمین کو بٹھایا گیا، مرحوم سربجیب ہوکر اپنے عام انداز و اطوار سے یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ میں ہی سب سے بڑا مجرم ہوں، ایک دِل پذیر وعظ ان کے سامنے فرمانے لگے، یہ تلخ فریضہ وہ کس کشمکش سے انجام دے رہے تھے اس کا اندازہ آپ کو اس سے ہوگا کہ وہ پسینے میں شرابور ہوچکے تھے، ندامت سے انہوں نے گردن نہیں اُٹھائی، اور جب وہ مجرمین سامنے سے اُٹھا دیئے گئے تو سرزنش کے لئے اصرار کرنے والوں سے بڑی تکلیف سے فرمایا کہ:

بھائی تم نے مجھ سے بڑا سخت کام لیا۔

اگر کبھی کوئی ان کی تعریف کرتا تو اپنی خلقی انکسار کی بنا پر ایک لطیف ترمیم کے ساتھ تعریفی جملے کو اس طرح واپس فرمادیتے کہ سننے والے عش عش کر کے رہ جاتے۔ گزشتہ سال سہارنپور میں تشریف فرما تھے، جسے حضرت کی تشریف آوری کی اطلاع ملتی وہ دوڑتا ہوا پہنچ رہا تھا، نشست گاہ بھرچکی تھی اور سامنے بھی آدمی کھڑے تھے، اتنے میں یوپی کے وزیرِ کابینہ یشپال صاحب پہنچ گئے، انہوں نے بہت سوچ سمجھ کر مجمع کی کثرت پر عرض کیا کہ:

حضرت جہاں شہد ہوتا ہے، وہاں مکھیاں پہنچ ہی جاتی ہیں۔

برجستہ فرمایا کہ ''بھائی شہد کو بھی تو مکھیاں بناتی ہیں۔'' وزیر موصوف اس برجستگی اور بذلہ

سنجی پر انگشت بدنداں رہ گئے۔

انتقام ان کے مزاج میں ڈھونڈے سے نہ ملتا، حریف حلقے کے ایک جغادری نے مجھ سے خود کہا کہ: ''فلاں صاحب کی وفات کے بعد ہمیں یقین تھا کہ مہتمم صاحب ہمارا تیا پانچہ کریں گے، مگر داد دیجئے اس شخص کے مزاج و اخلاق کو منتقمانہ آنکھ بھی ہماری طرف نہ اُٹھائی ہے۔'' دارالعلوم کا موجودہ عملہ باستثناء دو چار کے سب ان کے زیرِ احسان ہے، انہی کی شفقتوں اور عنایات نے انہیں برسرِ روزگار کیا، ترقی دی، منصب بڑھایا، پھر اکثریت انہی سے دُشمن کی حیثیت سے سامنے آئی، مگر اس درویش نے اس ذلیل مظاہرے پر کسی دن کسی مجلس میں یہ بھی نہ کہا کہ: ''فلاں صاحب میرے ممنونِ کرم ہیں یا میں ان کا محسن ہوں۔'' ان کے سکوت و خاموشی سے بعض اوقات شدید نقصان پہنچتا، مگر یہ خاموشی ان کی فطرتِ ثانیہ بن چکی تھی۔

مجلسِ شوریٰ کے توڑنے کا ان پر الزام عائد کیا گیا، حاشا وکلاّ، انہوں نے اس طرح کا کوئی قدم نہ اُٹھایا، بلکہ دِلّی کنونشن میں یہ مطالبہ ان سے کیا گیا تو اس مطالبے کی غیر معقولیت پر آدھ گھنٹہ تک بولتے رہے، تقریر کا ٹیپ آج تک موجود ہے، مگر ایک نادان نے مجلسِ شوریٰ میں ''ٹائیں ٹائیں فش'' کا پوسٹر نکال دیا اور یہ سفاہت و نادانی مرحوم کے کھاتہ میں پہنچی، مگر وہ اس پر بھی خاموش رہے۔ انہیں اپنے گلشن دارالعلوم سے کس قدر پیار تھا، اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ دارالعلوم کے دروازے ایک سال سے زائد عرصہ گزرا ان پر بند کردیئے گئے تھے اور اس مسلح انداز میں کہ مرحوم کی پرچھائیں بھی دارالعلوم پر نہیں پڑسکتی تھی، مگر ان کی آخری آرزو یہ تھی کہ میرا جنازہ دارالعلوم میں پڑھا جائے۔ الحمدللہ کہ ان کے اقرباء نے اپنے جذبات و احساسات کو ان کی آخری آرزو کی تکمیل میں حائل نہ ہونے دیا۔ آہ! کہ وہ دارالعلوم میں پھر زندہ نہ جاسکے بلکہ ان کا لاشہ ہی کاندھوں پر سوار ہوکر دارالعلوم میں پہنچا، ان کے ساتھ یہ ظلم کرنے والے خدا اور خدائی کو کیا جواب دیں گے؟ یقین ہے کہ کوئی عیارانہ

جواب اس کے لئے ڈھال لیا ہوگا۔ اب وہ شہرِ خموشاں کے مکیں ہیں اور زبانِ حال سے ان کی غمناک میّت کہہ رہی ہے کہ:

دَم بخود ہیں مقبروں میں، ہوں نہ ہاں کچھ بھی نہیں

مگر کیا عجیب ہے کہ چپ ہونے والی زبان احکم الحاکمین کے یہاں استغاثہ کرے، اور اگر ایسا نہیں ہوا، پھر تو یقیناً یہ ہوگا ؎

قریب ہے یارو روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

دو تین سال سے مطعون الجروح کردیئے گئے تھے، ان کی کردارکشی کے لئے جائز و ناجائز، گفتنی و ناگفتنی سب رَوا کرلیا گیا تھا، اب ان کا پورا خاندان دارالعلوم سے باہر ہے، نہ کسی کے پاس اقتدار اور نہ کوئی دارالعلوم کے سنگھاسن پر براجمان لیکن ان کا جنازہ جس شان وشوکت سے اُٹھا، جس اِخلاص و اِحتشام سے اُٹھایا گیا، وہ گویا کہ قدرت کے اس حکم کی تعمیل تھی ؎

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دُھوم سے اُٹھے

(ماہنامہ ''الخیر'' ملتان)